ترجمہ :- اصغر عباس

کارل سینڈبرگ

کارل سینڈبرگ ایک پندرہ "باعزم تخلیقی زندگی گذارنے کے بعد ۲۲ جولائی کو انتقال کر گیا۔ اس نے امریکہ کے گوشے گوشے میں گھوم کر اپنے ملک کی جمہوری زندگی کی قوت کا مشاہدہ کیا چنانچہ اس کی آزاد نظمیں اسی قوت کی مظہر ہیں ورنہ صرف عوام نے بلکہ علما و شعرا اور مدبروں نے بھی اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ صدر جانسن نے ۸۹ سالہ شاعر کو امریکہ کا مغنی کے لقب سے یاد کیا اور کہا کہ زندگی کا راستہ کارل سینڈبرگ کے لیے جو میرا دوست اور ان لاکھوں انسانوں کا رفیق و غمگسار تھا جن کے سفر زندگی کو اپنی شاعری کے ذریعہ اس نے روشنی گرمی اور رفعت عطا کی، اب ختم ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سرمایہ جو اس نے چھوڑا ہے لافانی ہے۔ کارل سینڈبرگ صرف امریکہ کی آواز ہی نہ تھا اور نہ ہی صرف وہ امریکہ کی قوت ذہانت اور ظرافت کا شاعر تھا بلکہ وہ بذاتہ امریکہ تھا۔ آج ہم اسے شاعر جمہور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور وہ عوام کی تمناؤں اور ان کے ضمیر کا عکاس اور حسن خیز نسل کے سینہ کا حاکم سمجھتے ہیں۔

کارل سینڈبرگ کے مزار کو کسی کتبہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ان شہروں اور میدانوں کے چپہ چپہ پر کندہ ہے جن سے اس نے پیار کیا اور ان تمام انسانوں کے چہروں پر رقم ہے جن کا ذکر اس نے اپنی نظموں میں کیا۔ جنہیں اس نے زندگی کی حرارت بخشی۔ پوری دنیا کے ساتھ ہم اس کے انتقال کا ماتم کرتے ہیں۔ بحیثیت امریکی ہونے کے یہ ہمارے لیے خصوصی فخر اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہم ہمیشہ کارل سینڈبرگ کے گائے ہوئے اپنی عظمت کے غیر فانی ترانے سنتے رہیں گے :

کارل سینڈبرگ نے امریکہ کا سب سے بڑا ادبی انعام PULITZER PRIZE دو بار حاصل کیا۔ پہلی مرتبہ ابراہم لنکن کی سوانح حیات کے لیے جو چھ جلدوں میں شائع ہوئی اور دوسری بار اپنی شعری تخلیقات پر کارل سینڈبرگ گیلسبرگ میں، جو شہر ہے میں پیدا ہوا ایک شہر ہے ایک سویڈش مہاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم مستقل طور پر نہ ہو سکی کیونکہ اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے اسے بہت سے کام کرنے پڑے۔ اس نے دودھ گاڑی کھینچی، ایک حجام کی دوکان پر ملازمت کی اور انیٹوں کے بھٹے پر بحیثیت ٹرک آپریٹر کام کرتا رہا۔

جب وہ سترہ سال کا ہوا تو اس نے صوبہ ہائے متحدہ کے مختلف علاقوں میں مزدور کی حیثیت سے گھومنا شروع کیا۔ اس نے گندم کے کھیتوں میں کام کیا اور ایک ہوٹل میں طشتریاں صاف کیں۔ اسی زمانے میں اسے لوک گیتوں کے سننے اور یاد کرنے کا موقع ملا جن کی وہ آگے چل کر ترتیب و تدوین کرنے والا تھا اور یہی وہ صنف سخن ہے جس میں اس نے خود طبع آزمائی کی۔

جب اسپین اور امریکہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو وہ فوج میں داخل ہو گیا اور محاذ جنگ کی سمت روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے اپنے شہر کے لومبارڈ کالج میں داخلہ لیا اور مختلف مسائل سے کسب معاش کرتا رہا۔ کبھی کبھی تو اسے پاسبانی بھی کرنی پڑی۔ کالج سے نکلنے کے بعد اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ ملی کے میئر کا سکریٹری ہوا۔ اب اس نے مختلف رسالوں اور جریدوں میں اپنی نظمیں بھیجنی شروع کیں۔ CORN HUSKERS (۱۹۱۸) GOOD MORNING AMARICA (۱۹۲۸) SLABS OF THE SUNBURNT WEST (۱۹۲۲) SMOKE AND STEEL (۱۹۲۰) THE PEOPLE YES (۱۹۳۶) اور EARLY MOON (۱۹۳۰) یہ اس کے چند شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ ان شعری تصنیفات کا موضوع امریکہ کے محنت کش عوام ہیں۔ اس کی نظموں میں خطابت کی گرمی یا بیان کی دلکشی نہیں بلکہ اس زندگی کے مکمل ذاتی تجربہ کی جھلک ملتی ہے جس کی وہ ترجمان ہیں۔ چنانچہ ان میں ان محاوروں کا بھی پاس رکھا گیا ہے جو اس طبقہ میں مروج ہے۔ سیدھے سادے مشاہدات میں اکثر وہ ظرافت اور طنز کا پہلو نکال لیتا ہے۔ تشریح اور وضاحت اس کا شعار نہیں کیونکہ وہ اپنے سامعین کی سخن فہمی اور ادراک پر بھروسہ کرتا ہے یہ اعتماد اس لیے بھی ہے کہ اپنی شاعری میں اس نے جا بجا انہیں کی کہاوتوں اور استعارات کا نہایت بے ساختگی سے استعمال کیا ہے۔ اس کی تصنیف 'THE PEOPLE, YES' حیرت انگیز بھی ہے اور حیات افزا بھی اسے کسی خاص صنف سخن سے منسلک کرنا محال ہے۔ کارل سینڈبرگ نے اس کتاب میں بے شمار کہاوتوں اور لطیفوں کے امتزاج سے ایک حسین اور دلکش امتزاج سے ہر شخص کی صلاحیتوں اور قوتوں میں اپنے ایقان و ایمان کا اظہار کیا ہے۔

سینڈبرگ نے مروج بحریں بھی اختیار نہ کیں۔ پھر بھی باوجود اس حقیقت کے اس کی آزاد نظمیں شاعری کے مقابلہ میں مترنم نثر سے زیادہ قربت رکھتی ہیں۔ اس کی تمام نظموں میں ایک گہری نغمگی پائی جاتی ہے۔ ان میں موسیقی کے آہنگ کا بھی اہتمام نظر آتا ہے جو نفس مطلب سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

لیکن سینڈبرگ کی شہرت کی اصل اساس اس کی تصنیف ابراہم لنکن کی سوانح حیات ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئیں جو صاحب سوانح کے ایام طفلی سے متعلق ہیں۔ ان جلدوں کو اس کتاب کی بقیہ چار جلدوں کا جو THE WAR YEARS کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں پیش لفظ سمجھنا چاہئے۔ THE WAR YEARS کا موضوع وہ عظیم انسانی اور تاریخی المیہ ہے جو زمانۂ خانہ جنگی میں امریکہ میں واقع ہوا۔ سینڈبرگ نے خانہ جنگی کو محض واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ عام انسان کی ابتری کے ذکر کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس کی اس تصنیف نے ثابت کر دیا ہے کہ لنکن کے سوانح نگاروں میں سینڈبرگ سب سے زیادہ حساس اور ہمدرد سوانح نگار ہے۔

امریکہ کے اس مشہور شاعر نے، جو امریکہ کا مغنی (MINSTREL OF AMERICA)

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱ پر)

انیس امروہوی

مکتوب لندن

بریڈفورڈ میں ہر ہفتے چالیس ہندستانی اور پاکستانی بچے اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں

بریڈفورڈ کے اسکولوں میں نئے داخلہ لینے والے تارکین وطن کی روز افزوں تعداد نے کارپوریشن اور محکمۂ تعلیم کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم مسٹر پارکر نے کہا کہ گذشتہ سال نئے داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد ایک ہزار تھی جبکہ اس سال اب تک ایک ہزار چھ سو طلبہ داخلہ لے چکے ہیں۔ اوسطاً چالیس تارکین وطن بچے ہر ہفتے داخلے لے رہے ہیں۔ جناب پارکر نے بتایا ہے کہ نئے داخل ہونے والے طلبہ کے لیے تین پرائمری اور ایک سکنڈری اسکول کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تعلیمی کمیٹی نے مزید گرانٹ حاصل کرنے کی درخواست دی ہے۔ اسی طرح کی صورت حال لیسسٹر کے محکمۂ تعلیم کو بھی درپیش ہے۔ تارکین وطن بچوں نے لیسسٹر میں بھی یہ مسئلہ پیدا کر دیا ہے کہ ان کی تعداد یکلخت دگنی ہو گئی ہے۔ جولائی سے پہلے تک نئے داخل ہونے والے طلبہ کی ماہانہ اوسط چالیس تھی اور اس کے بعد یہ اوسط بڑھ کر اسی ہو گئی ہے۔ ان بچوں کی روز افزوں تعداد کی بنا پر ۲۳ مقامی بچوں کو نزدیک کے اسکولوں میں داخلہ نہیں مل سکا۔ تعلیمی کمیٹی کے مطابق مرکزی حکومت کی گرانٹ کا ۷۰ فیصد حصہ صرف رنگدار بچوں کی تعلیم پر خرچ ہو گا۔ اس کے علاوہ اساتذہ کو بھی بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں کیونکہ نئے داخل ہونے والے رنگدار بچوں میں آدھے سے زیادہ انگریزی سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور باقی ماندہ ۵۰ فیصد میں سے ۴۰ فیصد "عجیب و غریب" انگریزی بولتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم ایسے انگریز اساتذہ کی تلاش میں ہے جو اردو، ہندی اور پنجابی سے واقفیت رکھتے ہوں۔

اردو میں صنعتی تربیت کا اہتمام

برمنگھم کے بیس کارخانوں کے تربیتی افسر پی۔ اے۔ داشر نے ہندپاکستانی باشندوں کو اردو اور بنگالی میں صنعتی امور کی تربیت دینے کے لیے مسٹر ایس۔ اے۔ قادری کی خدمات حاصل کی ہیں۔ تا حال یہاں سینکڑوں افراد محض انگریزی سے عدم واقفیت کی بنا پر صنعتی ہنرمندی حاصل کرنے سے محروم تھے اور بنا بریں ترقی کے منازل طے کرنا ان کے لیے نہایت دشوار تھا جبکہ انگریز مختصر مدت میں اعلیٰ مناصب حاصل کر سکتے تھے۔ مسٹر قادری نے توقع ظاہر کی ہے کہ اگر ہمارے بھائیوں نے مجوزہ جماعتوں میں دلچسپی لے کر ضروری تربیت حاصل کر لی تو ان کے لیے کارخانوں میں ترقی کرنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ انھیں یقین ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس بیش بہا سہولت سے فائدہ اٹھائیں گے۔

آفاقی خاتون کارکنان کے لیے اطلاع

ایک کارخانہ میں خاتون کارکنان کے لیے اطلاع کے عنوان سے یہ تحتی دیکھنے میں آئی۔ اگر آپ ڈھیلا لباس پہنتی ہیں تو مشینوں سے بچئے اور چست لباس زیب تن فرماتی ہوں تو کاریگروں سے۔

بزم تفریح لندن کی ماہانہ ادبی نشست

عبدالحلیم صدیقی جنرل سکریٹری بزم تفریح لندن اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۰ دسمبر بروز ہفتہ شام چھ بجے ماہانہ ادبی نشست ٹاؤن ہال متصل سینٹ جیمز پارک، لندن ایس۔ ڈبلیو میں منعقد ہو رہی ہے نشست کی صدارت کے فرائض چودھری اکبر خاں صاحب انجام دیں گے۔ اس نشست میں ممتاز شعراء، مزاح نگار اور موسیقار حصہ لیں گے۔ پروگرام حسب ذیل ہو گا۔

۶ تا ۶½ بجے شام چائے و تعارف
۶½ تا ۸ بجے شام شعر و شاعری
۸ تا ۹ بجے شام بزم موسیقی

اردو میں قانون کی کلاسیں

مانچسٹر کے مقامی ویلفیئر سینٹر کے زیر اہتمام اردو میں قانون کی کلاسوں کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ گذشتہ منگل کو بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ اس موقع پر جو اختتامی تقریب ہوئی اس سے مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام صابر خاں نے مانچسٹر یونی ورسٹی کے مسٹر نظم اور ویلفیئر سینٹر کے مسٹر نذر الدین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بھارتی و پاکستانی تارکین وطن کو یہاں کے قوانین سے کما حقہٗ آگاہ کرنے کے لیے اس طرح کی مزید کلاسوں کی ضرورت ہے۔

اپنی زبان میں بات کیجیے

ڈیوزبری کے محمد تاج بٹ نے ان انگریزی داں ہند و پاکستانی فورمینوں سے درخواست کی ہے کہ وہ کارخانوں میں کام کرنے والے ماتحت ہم وطنوں سے اردو اور ہندی میں گفتگو کریں تاکہ ان کی ترجمانی اور نمائندگی کے وقت گورے عہدہ داروں سے ان کی گفتگو بیر خواندہ حضرات بخوبی سمجھ سکیں۔ اس طرح اپنی زبان سے غداری بھی نہ ہوگی اور گوروں پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا اور ان کی عزت میں بھی اضافہ ہو گا۔ امید ہے یہ فورمین حضرات اپنے ہم وطنوں پر انگریزی دانی کا رعب جمانا ترک کر دیں گے۔

بی بی سی کے ریڈیو پروگرام میں زہرہ نگاہ کی شرکت

گذشتہ اتوار کو بی بی سی کے ریڈیو پروگرام میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کا انٹرویو اور ان کا تازہ کلام نشر ہوا دلچسپ تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ منی اسکرٹ کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے تو زہرہ نگاہ نے جواب دیا کہ منی اسکرٹ تو برطانوی باشندے بھی زیادہ پسند نہیں کرتے اس لیے یہ لباس عورتوں کے لیے کوئی مناسب پہناوا نہیں۔

زہرہ نگاہ جو اس سے پیشتر بھی برطانیہ کا دورہ کر چکی ہیں اس بات کی بہت قائل نظر آتی تھیں کہ یہاں کے ہوٹلوں میں نہ صرف صفائی بہت ہے بلکہ کھانا بھی اب پہلے سے اچھا ملتا ہے۔

وقت کی کمی کے باعث اس پروگرام میں اپنے دلنواز ترنم سے صرف ایک غزل سنا سکیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

جو لوگ زمانۂ حال کے ادبی رجحانات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ غالباً میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ گزشتہ چند برسوں سے ہندستان کے اردو رسالوں میں بڑی جان سی پڑگئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ دلچسپ اور گرماگرم بحثیں ہیں جو نئی شاعری کے بارے میں ہو رہی ہیں۔ یہ بحثیں مضامین و مقالات کے علاوہ ان مکاتیب و مراسلات کی صورت میں بھی سامنے آرہی ہیں جن میں نیا اور پرانا ناقد، نیا اور پرانا شاعر اور نئے اور پرانے قاری سبھی حصہ لے رہے ہیں۔ ان ادبی بحثوں میں جو کبھی کبھی مناظرے اور مجادلے کی صورت اختیار کرلیتی ہیں یہ فیصلہ کرنا کہ کون صحیح راستے پر ہے اور کس کی طرف سے ہٹ دھرمی کا اظہار ہو رہا ہے ابھی قبل از وقت ہے۔ ادب میں عصری تقاضوں اور اس سے پیدا شدہ تبدیلیوں کے عمل کو نہ پہلے کوئی روک سکا ہے اور نہ اب روک سکتا ہے۔ طرزِ احساس ذہنی رویّہ اور اسلوب اظہار کا جامد اور اٹل ہونا تو تشویشناک ہو سکتا ہے، ان کی تبدیلی اور شکست و ریخت سے اس قدر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زبان میں اس سے پہلے نئی شاعری کی دو منزلیں آچکی ہیں جواب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ آزاد اور حالی نے جس نئی شاعری کا پرچم بلند کیا اس کی مخالفت میں سینہ سپر ہونے والے اس زمانے کے قدامت پسند شعراء (دبیع اور دہ پنچ گروپ) اپنی جگہ پر مخلص رہے ہوں گے اور انھیں واقعی اس وقت کی نئی شاعری اردو زبان اور اس کی دیرینہ روایات کے حق میں ایک خطرہ معلوم ہوتی ہوگی۔ نئی شاعری کی دوسری منزل وہ تھی جب ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ کچھ نئے ذہنوں نے جنم لیا اس وقت اسے جن مخلصین ادب سے سابقہ پڑا وہ جعفر علی خاں اثر، اختر علی تلہری، ماہر القادری اور مداوا گروپ کے لوگ تھے۔ اب جبکہ نئی شاعری اپنی تیسری منزل میں قدم رکھ رہی ہے اور بعض "نادر ترین میلانات" کے ساتھ سامنے آرہی ہے اسے پھر اپنے بزرگوں کی "تلخ و ترش" باتیں سننی پڑ رہی ہیں میری ان باتوں کا ہرگز یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ نئی شاعری کے معترضین میں اور جعفر علی خاں اثر، اختر علی تلہری یا ماہر القادری وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ نئی شاعری کے معترضین ان سے مختلف ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کی ذہنی سطح بلند ہے بلکہ ان کے اعتراضات کی نوعیت بھی بدلی ہوئی ہے۔ یہ حضرات اصولی طور پر شعر و ادب میں تبدیلی کے عمل کو جائز اور فطری سمجھتے ہیں، یہ اس بات کا کبھی دبی زبان سے اور کبھی صاف صاف اقرار بھی کرتے ہیں کہ نئی شاعری سب کی سب بُری نہیں ہے بلکہ نئے شعراء میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے کلام کو وہ محبت کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے یہاں قابلِ قدر عناصر پاتے ہیں۔ میں نئی شاعری کے معترضین کی اس لحاظ سے بھی قدر کرتا ہوں کہ انھیں اپنے زمانے کے ادب اور ادیب اور ادبی مسئلوں سے دلچسپی ہے اور ان میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی شمولیت کو بھی وہ ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ ان گوشہ نشین بزرگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ تعریف ہیں جو زندگی اور زمانے سے بے تعلق ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنے قلم کی روشنائی خشک کرچکے ہیں بلکہ اب انھیں دوسروں کے لکھے ہوئے الفاظ اور حروف کے پڑھنے میں عار محسوس ہوتا ہے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ نئی شاعری سے متعلق گفتگو عام طور پر عمومی اور مبہم ہوتی ہے۔ ابہام کا اعتراض نئے شاعروں پر ہے لیکن اس کا شکار دراصل ہماری تنقید ہیں اور ہماری بحثیں ہیں۔ ہم تعریف بھی کرنے سے جھجکتے ہیں اور اعتراض کرتے ہوئے بھی ان لوگوں کا نام لینے سے گریز کرتے ہیں جن پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ نئی شاعری میں کھرا کیا ہے اور کھوٹا کیا ہے؟ نئی شاعری نئی ہے بھی یا نہیں؟ کیا اس نے تمام پچھلی روایتوں کو منسوخ کر دیا ہے؟ کیا نئی شاعری میں رویّے کی تبدیلی اور طرزِ احساس اور پیرایۂ اظہار کی تازگی تمام تر مسترد کر دینے کے قابل ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر کتنا حصہ قابلِ قبول ہے؟ کیا نئی شاعری کسی ایسے فرد کی تخلیق ہے جو سماج سے کٹ کر ایک علیحدہ اکائی بن چکا ہے اور سماج سے اس کا کسی قسم کا تعلق باقی نہیں ہے؟ یا اس شاعری میں سماج سے متعلق فرد کی بے اطمینانی اور اس بے اطمینانی کے نتیجے میں کرب و اضطراب کا اظہار ہے؟ کیا یہ بات نہیں ہے کہ نیا شاعر عقائد، اقدار اور خوابوں کی شکست کا المیہ اس لیے پیش کر رہا ہے کہ اسے کچھ عقائد، اقدار اور خوابوں کی ضرورت ہے؟ کیا پرانے عقائد، اقدار اور خوابوں کی شکست فرضی باتیں ہیں اور ان کا آج کے سماجی نظام میں کوئی وجود نہیں ہے؟ کیا موجودہ اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی زبوں

غزل

شہریار

صدائے دل کا یہ احسان مجھ پہ تھوڑا ہے
میں سو رہا تھا مجھے نیند سے جھنجوڑا ہے
خفا ہے ایک جہاں اہلِ شوق سے یارو
رُخِ حیات نئی سمت کو جو موڑا ہے
اضافہ روز ہی آبادیوں میں ہوتا ہے
جہاں میں اہلِ تمنا کا پھر بھی توڑا ہے
کسی افق پہ نہ جب روشنی نظر آئی
مری نگاہ نے رشتہ خلا سے جوڑا ہے
ابھی سے مجھ کو رقیبوں میں اپنے گنے لگے
ابھی تو میں نے خموشی کا سحر توڑا ہے

سے نئے شاعر کی بیزاری اور برہمی غیر حقیقی ہے؟ کیا موجودہ صورت حال میں بھی واعظانہ اور خطیبانہ لہجہ، سماجی الجھن، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی تقسیم، انقلاب، امن، سرخ سویرا اور دیگر قسم کے نعروں اور مفروضوں کی شاعری ہمیں متاثر کر سکتی ہے؟ اگر کچھ لوگ ابھی تک اسی صورت حال سے گزر رہے ہیں تو وہ اپنے اور اپنے قارئین کے لیے اس قسم کی شاعری اب کیوں نہیں کرتے؟ انھیں آخر کون سی طاقت روک رہی ہے۔ نئی شاعری اگر لوگوں کے لیے مبہم اور ناقابلِ فہم ہے اور وہ ترسیل و ابلاغ کے تقاضوں سے روگردانی کرتی ہے تو اس سے قاری پر کیا منفی اثر مرتب ہو سکتا ہے؟ مثبت اور منفی اثر تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ لوگوں کی سمجھ میں آئے؟ اگر نئی شاعری ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی، لولی لنگڑی، سپاٹ اور بے اثر ہے تو اسے خود ہی کوئی نہیں پوچھے گا اور نہ یہ مقبولیت حاصل کر سکے گی پھر نئی شاعری سے آپ لوگ کیوں خوف زدہ ہیں؟ ایسا تو نہیں ہے کہ نئی شاعری کے معترضین کے دل میں کہیں یہ چور چھپا ہوا ہے کہ نئی شاعری اپنے قارئین کا حلقہ تیزی سے بڑھا رہی ہے اور یہ قارئین پچھلی نئی شاعری کو معقول اور نئی شاعری کو کہ اب اس کا ذکر حقارت سے کرنے لگے ہیں اور ان کے دل میں اپنے ان سابق شعراء کے لیے عقیدت و احترام کا وہ جذبہ باقی نہیں رہا جن کے وہ کسی زمانے میں مستحق سمجھے گئے تھے؟ کیا نئی شاعری کے ناقدین اور معترضین نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ آج کی شاعری کے بارے میں اس قدر درشت رویہ اختیار کرنے سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ماضی قریب کے شعری سرمائے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس کے کھرے کھوٹے کو الگ کیا جائے؟ کوئی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانۂ حال کی شاعری پر بھی کڑی نظر رکھنی ضروری ہے تاکہ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی بروقت ہو سکے ورنہ اگر اس شاعری میں کچھ منفی رجحانات ہیں تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو پچھلی نئی شاعری کے بیشتر سرمائے کا ہوا؟ یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے لیکن میں اپنے ان کرم فرماؤں سے درخواست کروں گا کہ میرے پچھلے تمام سوالات کو ذہن میں رکھ کر نئی شاعری کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کریں جس کے لیے ان تمام شعری مجموعوں کی فراہمی ضروری ہوگی جو گزشتہ چند برسوں میں ہندوستان سے شائع ہوئے ہیں۔ ان مجموعوں کی روشنی میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں اور مثالیں دینے سے پرہیز نہ کریں۔

مجموعوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) رشتۂ دل	(براج کومل)
(۲) خالی مکان	(محمد علوی)
(۳) اسمِ اعظم	(شہریار)
(۴) نیا عہد نامہ	(خلیل الرحمن اعظمی)
(۵) بازدید	(شہاب جعفری)
(۶) سند باد	(عمیق حنفی)
(۷) پرانے موسموں کی آواز	(کمار پاشی)
(۸) برگِ نوخیز	(عزیز قیسی)
(۹) پتھروں کا مغنی	(وحید اختر)
(۱۰) لہر لہر ندیا گہری	(زبیر رضوی)
(۱۱) گفتنی	(محمود سعیدی)
(۱۲) تراشیدہ	(شاذ تمکنت)
(۱۳) کالے کاغذ کی نظمیں	(باقر مہدی)
(۱۴) چاندنی اسا سے کی	(راج نرائن راز)

ان مجموعوں کے علاوہ بعض ایسے شعراء کے کلام کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کرنا پڑے گا جو خاصے نمایاں ہو چلے ہیں لیکن ابھی انھوں نے اپنا شعری مجموعہ ترتیب نہیں دیا ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعریٰ، محمود ایاز، شہاب جعفری، بشر نواز، عزیز قیسی، حمید الماس، ندا فاضلی، عادل منصوری، بشیر بدر، بلراج کومل، انسک، صادق، موتی، فضل تابش، شمیم حنفی، حسن فرخ، تاج بہوری، عتیق تابش، پرکاش فکری، عصمت، اقبال یوسفی، مظفر حنفی، علیم اللہ حالی، شمس الرحمن فاروقی، رؤف خش وغیرہ۔

ابھی کچھ دن پہلے ادارہ شب خون الہ آباد سے نئے شاعروں کا ایک انتخاب "نئے نام" شائع ہوا ہے۔ اس انتخاب سے بھی نئی شاعری کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

میں خود بھی نئی شاعری کے بارے میں بعض مسائل پر الگ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پاکستان کے نئے شعراء اور ان کے مجموعوں پر بھی علیحدہ اظہارِ خیال کی ضرورت ہے۔

تصحیح

کوکب قدر سجاد علی مرزا کے مضمون "بیگمات اودھ کے خطوط کا تاریخی پس منظر" مطبوعہ ہماری زبان یکم دسمبر ۱۹۶۷ء میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ان کی تصحیح درج ذیل ہے۔

۱۔ ص۳ کے دوسرے فوٹ نوٹ کا نمبر ۱ لکھا ہے ۲ ہونا چاہیے۔ اور اسی فوٹ نوٹ میں "بحوالہ اخبار انگلشمین مورخہ ۱۸۵۶/۵/۱۳ء لکھا ہے" ۱۸۵۶/۵/۱۴ء ہونا چاہیے۔

۲۔ ص۸ کے فوٹ نوٹ میں "ہی ص۳۳۱ لکھا ہے ص۱۳۲ ہونا چاہیے۔

۳۔ ہماری زبان مورخہ ۱۹۶۶/۱۲/۸ء کے شمارے میں صفحہ ۷ کا حاشیہ حسب ذیل ہے۔

۱؎ نقوش، جنوری ۱۹۶۶ء ص۲

مراسلات

جاسوسی ادب ایک ناسور

کچھ دنوں قبل 'ہماری زبان' پندرہ اکتوبر ۹۵ء میں ایک مراسلہ بعنوان "جاسوسی ادب اور نقاد" شائع ہوا تھا جس میں مراسلہ نگار نے جاسوسی ادب کی خوبیوں کو گناتے ہوئے اور اس کی افادیت پر زور دیتے ہوئے اس ادب کو نقاد صاحبان کی توجہ کا مستحق قرار دینے کی سعی فرمائی ہے اور بطور ثبوت مثالیں بھی پہنچائی ہیں۔ ممکن ہے ان کا خیال درست ہو مگر مجھے اس باب میں ان سے اختلاف ہے لہٰذا میں اپنا خیال قارئین ہماری زبان تک پہنچانے کے لیے "ہماری زبان" کا سہارا لے رہا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ جاسوسی ادب نے مختصر عرصہ میں بہت زیادہ ترقی کی ہے اور کم علم ذہن رکھنے والوں میں کافی مقبول ہوا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز کا قلیل مدت میں ترقی کر جانا کیا اس کی افادیت کی ضامن ہے؟ ہیضہ اور پلیگ جیسی متعدی موذی اور مہلک بیماریاں آناً فاناً پھیل جاتی ہیں مگر کیا ہم ان میں افادہ پاتے ہیں؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جاسوسی ناول ہمیں طرح طرح کے مجرمانہ ہتھکنڈوں سے محفوظ رہنا سکھاتا ہے۔ مگر کیا مجرم کا کردار کچی عمر کے بچوں پر ناگوار اثر نہیں چھوڑتا ہے؟ اس میں کیا شک کی گنجائش ہے؟ مصنف کا جاسوس یا مجرم کی زبان سے ادا کرایا ہوا فقرہ یا کرائی گئی حرکت پڑھنے والوں پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے نتیجے کے طور پر وہ لوگ گھر میں ان نادیوں کو آزماتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں یہ باتیں زور پکڑتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ ناول کے انجام میں مجرم کی گرفتاری نفرت کے جذبہ کو ابھارتی ہے اور پڑھنے والا اس پیشہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک حد تک صحیح ہے مگر اس بات سے تو کوئی منکر نہیں ہو سکتا کہ اچھی باتوں کا جو اثر پڑتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے جبکہ بری عادتوں کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ سنیما ہی کو لیجئے شاید ہی کچھ لوگ ایسے ملیں جو تصویر (PICTURE) دیکھ کر اس سے نصیحت حاصل کرتے ہوں ورنہ لوگ فیشن پرستی اور دیگر لغویات کو سیکھتے ہیں۔ لہٰذا میری نظر میں فلم یا جاسوسی ناول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جاسوسی ناول ہمیں سستی تفریح مہیا کرتا ہے جو جرائم کے ساتھ ہلکی پھلکی تفریح سے پر ہوتا ہے اور ہمیں وقتی سرور مہیا کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ گھسی پٹی کہانیوں اور اوچھے مکالموں کے ذریعہ ہمارے ذہن کو سطحی بنا دیتا ہے۔ جو صرف سطحی طور پر سوچنے سمجھنے کے لائق رہ جاتا ہے۔ ہمارا ذہن کسی بات کی گہرائی میں جانے سے گھبراتا ہے نتیجے کے طور پر باریک بینی رخصت ہو جاتی ہے اور ادب کی معیاری کتابیں خشک معلوم ہونے لگتی ہیں۔

کسی کتاب کی اہمیت کا انحصار مصنف کی تحریر پر ہوتا ہے نہ کہ کسی اور کے گھسے پٹے کردار پر۔ اگر کسی جاسوسی ناول کے مصنف کا تخلیق کردار قبول عام ہو جاتا ہے تو ہر مصنف اس کردار کو اپنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا بھرم کھو بیٹھتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی جاسوسی ناول کو ایک بار پڑھنے کے بعد اس کی وقعت پڑھنے والے کی نظر میں یکسر ختم ہو جاتی ہے؟ کسی مصنف کا وہ کردار جو قبول عام ہو چکا ہے ہر مصنف کا اس کو تختہ مشق بنانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

المختصر ہمارے نوجوانوں میں مجرمانہ حرکت کی داغ بیل ڈالنے میں جاسوسی ناول نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادب نہیں، ادب کے نام پر ایک ناسور ہے جسے سستی شہرت کے متمنی پیشہ ور ادیب اور پیسہ کمانے بلکہ جھونے والے سیٹھ ساہوکاروں نے ادب کا نام دے کر عوام کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ ایک دن وہ آنے والا ہے جب یہ پٹی کھلے گی، وہ دن دور نہیں جب جاسوسی ادب کی قلعی کھلے گی، تو عوام دیکھیں گے کہ جاسوسی ادب، ادب کے نام پر کلنک کا ٹیکہ تھا جسے نہ جانے وہ کیا کیا سمجھے ہوئے تھے۔

یوں تو اس میں برائیاں اور خامیاں اتنی ہیں کہ صفحے کا صفحہ سیاہ کیا جا سکتا ہے مگر میں نے مختصر طور پر مندرجہ بالا سطور میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اور صاحبان بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

(محمد ابو نصر)

ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادف کیا ہیں؟

(۱)

RESURRECTION کا اردو ترجمہ کیا ہے؟ اصطلاحی معنوں میں ریسرکشن یوم حشر کو کہتے ہیں۔ وہ دن جب تمام مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا لیکن میں نے انگریزی میں اس لفظ کو اکثر جگہ کسی بھی چیز کے دوبارہ زندہ کرنے کے معنوں میں دیکھا ہے۔

میرے خیال میں اس کے لیے "احیا" کا لفظ موزوں رہے گا۔ گو احیا عموماً تجدید کے معنوں میں مستعمل ہے لیکن دونوں میں کافی فرق ہے۔ احیا حیات دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ تجدید ایک کہنی کے جدید کو، جواب عزِ قدیم بن گیا ہے پھر سے رواج دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ تجدید میں ارتقا کا عنصر برقرار رہتا ہے خواہ وہ منفی ارتقا ہی کیوں نہ ہو یعنی اس کا سلسلہ بدستور رہتا ہے کوئی کڑی ٹوٹتی نہیں لیکن احیاء میں ایک عمل یک لخت رک جاتا ہے یہی عمل دوبارہ جاری ہو تو گویا اسے حیاتِ نو ملتی ہے۔

میری گزارش ہے کہ ارباب زبان اس پر روشنی ڈالیں۔

(ن۔ م۔ سعید)

(۲)

HOME - SICK کے لیے اردو میں کونسا مترادف لفظ بنائیں گے؟ ..... "ہماری زبان" کے ذریعہ اس کی اطلاع دیں۔ (سید عبد الخلاق)

(۳)

قارئین 'ہماری زبان' سے گزارش ہے کہ HONEY MOON کا اردو میں صحیح ترجمہ کیا ہوگا جب کہ بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس کا ترجمہ اس طرح سے ہوتا ہے۔ ۱۔ "لیلۃ العسل" ۲۔ ماہ عسل ۳۔ شب عروسی۔ ۴۔ شب زفاف۔ ۵۔ شب دوشیزہ

اگر سنی مون کا ترجمہ شہد شبنم کیا جائے تو اہل زبان کی رائے کیا ہوگی۔　(حسین احمد خاں)

ڈاکٹر مسعود عالم کے استفسار کے جواب میں

ہماری زبان ۸ نومبر ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر مسعود عالم کا ایک استفسار شایع ہوا ہے۔ ڈاکٹر مسعود عالم کی خدمت میں عرض ہے کہ حیدر آباد دکن میں ناکتخدا لڑکی کے لیے بدا جزاری۔ استعمال ہوتا ہے۔ ڈنکن فوربس کی ڈکشنری مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں بھی یہی معنی موجود ہے۔ اردو زبان میں بن بیاہی یا کنواری کے بجائے یہی استعمال ہونا مناسب ہے۔ جس کے ایک سے زیادہ معنی ہیں۔　(سجاد مرزا)

علمی مسئلے کے بارے میں مزید تحقیق

میں نے ہماری زبان مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء میں حروف ٹ، ڈ اور ڑ کی نسبت چار نقطوں کی بجائے ط لکھنے کے تعلق سے مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کو ان کا مسلح اور موجد قرار دیا تھا۔ میرا یہ ادعا بلحاظ کتابت مشرقی ہند اور جنوبی ہند کی حد تک صحیح ہے۔ چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانے میں، جو کئی ہزار قلمی کتابوں کے علاوہ پندرہ ہزار مطبوعات پر مشتمل ہے تین اردو کتابیں انیسویں صدی کے اوائل کی ایسی ملیں جن میں مذکورہ بالا حرفوں کی کتابت میں (ط) کا وجود نہیں ہے۔ ان میں (۱) تپ اور اسہال کے علاج کا رسالہ مترجمہ حکیم مولوی عبدالمجید مطبوعہ ۱۸۳۱ء کلکتہ (۲) منہاج العابدین (ترجمہ کیمیائے سعادت) مترجمہ محمد عبدی مطبوعہ ۱۸۵۸ء مطبع منظر العجائب مدراس (۳) اصول جرثقیل مترجمہ خان جہاں مطبوعہ ۱۸۶۵ء مطبع انوار اعظم مدراس ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھی کتاب معادر الافعال مولفہ سید عبدالفتاح مدرس عربی فارسی ایلفنسٹن بمبئی مطبوعہ ۱۸۷۰ء مطبع حیدری بمبئی ہے، جو میرے پاس موجود ہے۔ انہی شواہد کی بنا پر میں نے مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کو مصلح و موجد بیان کیا تھا لیکن شمالی ہند کی مطبوعات کی مزید چھان بین کرنے پر موصوف کی نسبت میرا خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ شمالی ہند اور جنوبی ہند میں ٹ ڈ اور ڑ کی کتابت میں فرق پایا گیا، وہاں ان کی جگہ (ط) ہی لکھی جاتی رہی اور یہاں ابتدا میں چار نقطے دیے جاتے رہے بعد میں (ط) کا استعمال ہوا۔

واضح ہو کہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج اور ۱۸۰۱ء میں اس کا ٹائپ پریس قائم ہوا اور ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۲۹ء تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر فارسی خط کے ٹائپ پریس نجی طور پر قائم ہوئے جہاں کتابیں اور اخبارات چھپتے رہے۔ فارسی خط کے ٹائپ پریس کا موجد چارلس ولکنس تھا، جو مشرقی علوم کا ماہر تھا۔ اس نے پہلے بنگلہ کا پھر فارسی خط کے ٹائپ تیار کیے۔ ۱۸۳۰ء میں ہندوستان کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی اور اسی سال کانپور میں مسٹر آرچر نے سب سے پہلے لیتھو پریس قائم کیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان میں لیتھو پریسوں کا رواج ہوا۔ اردو کتابوں اور اخبارات کی طباعت و اشاعت انہی کے ذریعے ہونے لگی۔

میرا خیال ہے کہ فارسی خط کا ٹائپ تیار کرتے وقت ہی فورٹ ولیم کالج کلکتہ ہی میں اہل علم کے مشورے سے اوپر کے حروف کی کھاوٹ میں اصلاح کی گئی۔ رفتہ رفتہ اس میں اور بھی اصلاحیں ہوئیں۔ چنانچہ کالج مذکور کی ۱۸۰۱ء کی مطبوعات میں ان حرفوں کا ٹائپ یوں تھا۔ مثلاً: ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔ مجھے ادارے کے کتب خانے میں مترجم انجیل مقدس کا ایک نسخہ ملا، جو مشین پریس سری رام پور کا ۱۸۱۴ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ ہنری مارٹن نے کیا ہے اور یہ مرزا فطرت منشی فورٹ ولیم کالج اور دیگر صاحبان کا اصلاح شدہ ہے۔ اس ٹائپ میں پہلے کی نسبت زیادہ اصلاح ہوئی ہے۔ اس میں اوپر کے حروف اس طرح ٹائپ ہیں مثلاً ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

جیسے جیسے شمالی ہند میں لیتھو کا چلن شروع ہوا ساتھ ہی ساتھ اس پر ٹائپ کا بھی اثر پڑا۔ لیتھو کی کتابوں اور اخبارات میں ان حرفوں کی کتابت میں ٹائپ کی تقلید کی جانے لگی۔ اس کا ثبوت ادارے کے کتب خانے کی مندرجہ ذیل کتابوں اور اخبارات کی کتابت سے ملتا ہے۔

(ا) کتب۔ (۱) رسالہ ہیئت مترجمہ سید کمال الدین حیدر ۱۸۴۶ء مطبع سلطانی لکھنؤ۔ ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

(۲) کیمیت کرم مولفہ کالی رائے۔ ۱۸۴۹ء۔ دہلی اردو اخبار پریس
ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

(۳) قیامت نامہ مترجمہ محمد رضا۔ ۱۸۵۵ء۔ مطبع مصطفائی کانپور
ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

(ب) اخبارات۔ (۱) فوائد الناظرین، ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ۱۸۴۶ء چھاپہ خانہ اردو دہلی اخبار۔
ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

(۲) دہلی اردو اخبار، ایڈیٹر محمد باقر۔ ۱۸۵۰ء، دہلی اردو اخبار پریس۔
ٹ = ٹ، ڈ = ڈ، ڑ = ڑ۔

اوپر کے مذکورہ خاکے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹ، ڈ اور ڑ کی کتابت میں (ط) کا استعمال ۱۸۰۹ء (قیام مشین پریس سری رام پور) کے بعد سے آغاز ہوا۔ اس کا عمل پہلے ٹائپ میں ہوا اور آخر میں لیتھو میں۔　(غلام رسول مصلح اردو رسم خط)

سہ لسانی فارمولا اور اردو

اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیرِ اہتمام سمپوزیم

اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیرِ اہتمام سہ لسانی فارمولا اور اردو کے موضوع پر ایک سمپوزیم ہوا۔ سید عالم خوندمیری صاحب نے تقریر کرتے ہوئے بعض اہم مسائل پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں نے جو اعتذاری رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے بڑا نقصان پہونچ رہا ہے اس لیے یہ رویہ ختم ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی بہ یک وقت علاقائی اور رابطے کی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر ہندی کو یہ دہرا درجہ دیا گیا تو نہ صرف تمام علاقائی زبانوں کا موقف کمزور ہو جائے گا بلکہ ہندی والوں کو ہمیشہ کے لیے غیر ہندی علاقے کے باشندوں پر برتری اور بالادستی حاصل ہو جائے گی جس کو کوئی بھی خود پسند برداشت نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ جس علاقے کو ہندی کا علاقہ کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل کئی زبانوں کے علاقوں پر مشتمل ہے، وہ دن دور نہیں جب کہ ان علاقوں کی زبانیں اپنا حق مانگیں گی اور نام و نہاد ہندی علاقہ سمٹ کر رہ جائے گا۔ عالم صاحب نے انگریزی زبان کی مخالفت کرنے والوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ ہم پر بیرونی دنیا کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوگی تو ایک طرف ملک کی وحدت کو سخت نقصان پہونچے گا اور ملک مختلف خانوں میں بٹ جائے گا، اور دوسری طرف ہم بین الاقوامی رابطے کی ایک ایسی زبان سے محروم ہو جائیں گے جس نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ کو ترقی دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں دو ہی زبانیں ایسی ہیں جو رابطے کی زبان بن سکتی ہیں، ایک انگریزی اور دوسرے اردو بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی دو زبانیں آج رابطے کی زبان کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ اس نقطۂ نظر سے اردو کے مقصد کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ عالم صاحب نے دستور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی مقدس کتاب نہیں جس میں ترمیم نہیں ہو سکتی، اس لیے اگر دستور میں اردو کے جائز حق کی تعمیل کی گنجائش نہیں ہے تو اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین نے اپنی تقریر میں دو لسانی اور سہ لسانی فارمولوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو دو لسانی فارمولا پیش کیا تھا وہ انتہائی حقیقت پسندانہ تھا۔ اگر اس فارمولے کو قبول کر لیا جائے اور اس پر دیانت داری کے ساتھ عمل کیا جائے تو ہندستان کا لسانی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مخدوم صاحب نے کہا کہ اردو کا مسئلہ فرقہ واریت، علاقائیت اور لسانی سامراج کے خلاف جہاد بن گیا ہے۔

اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، پنجاب، راجستھان اور بعض دوسری ریاستوں میں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۵ کروڑ سے زیادہ ہے اس لیے اس کو نظر انداز کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مخدوم نے سوویٹ یونین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہاں چھوٹی چھوٹی زبانوں کو ترقی دی گئی اور ایسی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا جن کا اپنا کوئی رسم خط نہیں تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سوویٹ یونین میں روسی زبان کو دوسری زبان بولنے والوں پر مسلط نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک روسی زبان سیکھتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی کسی زبان کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہیے۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے مخدوم نے کہا کہ اردو والوں کو تحتانی درجوں سے لیکر یونیورسٹی کی سطح تک اردو میں تعلیم پانے کے مواقع دیے جانے چاہئیں اور اردو والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس علاقے میں بستے ہیں اس علاقے کی زبان کے سیکھنے میں کوتاہی نہ کریں۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے ہندی والوں کی عصبیت پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اردو ہی کو نہیں خود ہندی زبان کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے، جنوبی ہند میں ہندی کے خلاف جو جذبات ابھر رہے ہیں اس کے ذمہ دار خود ہندی والے ہیں۔ اگر اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو رابطے کی زبان کی حیثیت سے ہندی کے رواج کے امکانات محدود بلکہ موہوم ہو جائیں گے۔ سہ لسانی فارمولے اور اردو کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ جہاں تک آندھرا پردیش کے اردو والوں کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں ہر سطح پر اپنی مادری زبان میں تعلیم کا موقع حاصل رہنا چاہیے۔ انھوں نے حسینی شاہد کی پیش کی ہوئی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے طالب علم کی تعلیم کا آغاز اردو سے ہوگا دوسرے مرحلے پر اس کو تلگو پڑھنی چاہیے، تیسرے مرحلے پر اس کو اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ ہندی اور انگریزی میں سے کسی ایک زبان کو منتخب کرے۔ انھوں نے کہا جہاں تک افادیت کا تعلق ہے ہندی کے مقابلے میں انگریزی زیادہ کارآمد ہوگی۔ اس لیے وہ شخصی طور پر اردو والوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اسٹیج پر انگریزی زبان سیکھیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندی سے عدم واقفیت کا کوئی نقصان اس لیے نہیں ہو سکتا کہ فی الحال انگریزی ہی رابطہ کی زبان کی حیثیت سے برقرار ہے اور جب ہندی انگریزی کی جگہ لے گی تو ہمارا طالب علم انگریزی کی بجائے ہندی پڑھ سکتا ہے۔ ہندی اور اردو کے فرق کے تعلق سے حبیب الرحمٰن صاحب نے کہا کہ ان کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

اس لیے ہمارے طالب علم اگر دیوناگری رسم خط سیکھ لیں تو آسان ہندی میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں یہی دراصل مستقبل کی ہندی ہوگی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اگر ہم وسعت نظر سے کام لیں تو لسانی مناقشے آسانی کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں۔ اگر سہ لسانی فارمولے کو کسی ذہنی تحفظ کے بغیر رائج کیا جائے تو ملک کی تمام زبانوں کی ترقی کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اترپردیش میں محض اردو دشمنی کی وجہ سے سہ لسانی فارمولے کو مسخ کیا گیا اور اردو کی جگہ سنسکرت کو ٹھونسا گیا۔ انگریزی کے تعلق سے انھوں نے کہا یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزی زیادہ دنوں تک ہندستان میں رائج نہیں رہ سکتی ہے علاقائی زبانیں اس کی جگہ لے کر رہیں گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی میں کوئی بیر نہیں ہے، ہندستان کی یہی دو زبانیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب تر ہیں۔ ہندی کے انتہا پسند اس ایک بات کو سمجھ لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سہ لسانی فارمولا اور اردو کے تعلق سے جو تجویز اس سمپوزیم میں رکھی گئی ہے وہی اردو والوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے اور اس کو آندھرا پردیش میں آسانی کے ساتھ روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔

اردو زبان کے مسائل

اردو آرٹس ایوننگ کالج حیدرآباد میں پروفیسر احتشام حسین کی تقریر

پروفیسر احتشام حسین نے بزم اردو ادب اردو آرٹس کالج کے زیر اہتمام تقریر کرتے ہوئے اردو کے موجودہ موقف پر کافی مبسوط روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ آج اردو کے جو اہم مسائل ہیں ان میں اس کی بقا، ترویج اور ادبی توسیع کو خاص اہمیت حاصل ہے اور محبان اردو کو چاہیے کہ وہ انفرادی طور پر اس بات کا فیصلہ کریں کہ اردو کے کس محاذ پر وہ زیادہ بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم شاعروں اور تخلیق کام کرنے والوں کو سیاسی میدان میں اردو کی بقا کی طرف کام کرنے پر مجبور کریں تو تخلیق کام ختم ہو جائے گا اور ہمیں اس بات کی اہمیت کو محسوس کرنا چاہیے کہ زبان صرف اپنے وجود کے لیے باقی نہیں رہتی بلکہ خیال کے اظہار کے لیے زندہ رہتی ہے۔

شمالی ہند میں اردو کے موجودہ موقف کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین نے کہا کہ شمالی ہند کے نوجوانوں اور طالب علموں میں اردو کے متعلق عام طور پر بے حسی پائی جاتی ہے۔ کچھ ایسے طالب علم ضرور ہیں جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو کر اردو کی خدمت کے لیے آگے بڑھتے ہیں لیکن آگے چل کر ان کی پہلی وابستگی اپنی سیاسی جماعت سے ہو جاتی ہے اور اردو محض ایک ثانوی مسئلہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یوپی میں سہ لسانی فارمولا کو روبہ عمل لانے میں اردو کو جس طرح نظرانداز کیا گیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے احتشام صاحب نے بتایا کہ یوپی کے اسکولوں میں ہندی، انگریزی اور سنسکرت پڑھائی جا رہی ہے۔ آج اردو کے طالب علموں اور اساتذہ کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرتے وقت اس مسئلہ پر بھی غور کریں کہ انھیں زبان کی بقا کے کن کن پہلوؤں پر جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں پروفیسر احتشام نے کہا کہ اردو کی دوسری دلکشیوں اور سلاست سے قطع نظر اردو نے ہندوستان کے تہذیبی دھاروں کو جوڑنے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے میں صرف اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو نے فرقہ پرستی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں اور یکجہتی جمہوریت کا پرچار کیا۔ جدید ادب کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں جدید ادب کا مخالف نہیں ہوں لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ نئے ادب کی تخلیقی صلاحیتوں کا دھارا ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل کو چھوڑ کر دوسری طرف بہنے لگے۔ جلسے کے اختتام پر اردو آرٹس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حسینی شاہد نے احتشام صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ہندی کے ساتھ دہلی میں اردو کو اس کی جگہ ملنی چاہیے

کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کا بیان

دلی ۱۸ دسمبر۔ جناب ایم فاروقی سکریٹری دلی صوبائی کونسل کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے حسب ذیل بیان دیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی دہلی ایڈمنسٹریشن کے ہر اس قدم کی پر زور حمایت کرتی ہے جس کا مقصد انگریزی زبان کو ہٹا کر ہندی کا لاگو کرنا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی چاہتی ہے کہ ایڈمنسٹریشن اور عدالتوں کا کام علاقائی زبان میں ہی ہونا چاہیے۔ لیکن دہلی میں ہندی کی جگہ کو مان کر اردو زبان کو ترقی دینا اور اردو کے لیے ضروری سہولیات مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ اردو زبان بولنے والے شہریوں کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اردو زبان میں درخواستیں سرکاری محکموں اور عدالتوں میں دے سکیں۔ سرکار کو چاہیے کہ اہم سرکاری اعلانات اور راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی شائع کریں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے اردو تعلیم حاصل کرنے کا پورا انتظام ہونا چاہیے۔ اردو زبان بولنے والوں کے لیے اس قسم کی سہولیات دہلی میں حاصل کرنا کسی بھی خیال کے انسان کے لیے قابل اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دلی کی تمام سیاسی پارٹیاں جن میں جن سنگھ بھی شامل ہے اپنے پوسٹر وغیرہ ہندی اور اردو دونوں میں ہی نکالتی ہیں۔ اردو کو اس کی جگہ دینے کی مانگ جمہوریت کی بنیاد پر ہے۔ اس کو ہندی کے مقابلے میں نہیں لایا جا رہا ہے۔ ہماری پارٹی بے شک اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہونے کی وجہ سے ایسی جگہ ہے جہاں ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے بہت سے لوگ بھی رہتے ہیں۔ ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ ان سب کو ایسی سہولیات دی جائیں جن سے وہ اپنی علاقائی زبانوں کے اسکول کو چلا سکیں تاکہ ان کے بچوں کی تعلیم پر کوئی اثر نہ پڑے۔ (الجمعیۃ)

انجمن نئے فنکار کا جلسہ

ادبی انجمن نئے فنکار رنگرو گھوسی کی ایک نشست ۲۰ دسمبر کو ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جس میں انجمن کے اصول و کارکردگی کا جائزہ لیا گیا۔ اتفاق رائے سے یہ بات طے پائی کہ سیاست حاضرہ سے اس ادبی انجمن کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

بعد ازاں مصطفیٰ کمال، ساد شاہ حسین رضوی، اشفاق حنفی، اعجاز گرانی، مونس مجودی، انجم جونانی اور صدر جلسہ نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

(مصطفیٰ کمال ناظم نشر و اشاعت)

سائن بورڈ پر اردو بھی لکھوائیے اردو محافظ دستہ کی اپیل

لکھنؤ۔ اردو محافظ دستہ لکھنؤ کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ آج جناب خلیق احمد کی صدارت میں مقامی شاخ کے دفتر میں ہوا۔ جلسہ نے لکھنؤ کے عوام اور تاجروں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے سائن بورڈوں پر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی لکھوائیں تاکہ اردو داں عوام کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جلسہ نے طے کیا کہ مقامی دستہ کے رضاکار شہر کے تمام بازاروں میں گشت کریں گے اور عوام سے اپیل کریں گے کہ وہ سائن بورڈوں پر اردو بھی لکھوائیں۔ (قومی آواز)

(باقی صفحہ ۳ سے آگے)

بھی کیا جاتا ہے نثر میں بھی دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی ALWAYS THE YOUNG STRANGER ایک خود نوشت سوانح حیات ہے جس میں اس نے اپنے ابتدائی اکیس برسوں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اور دوسری کتاب REMEMBRANCE ROCK جس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے بھی زیادہ ہے، اس کا تنہا ناول ہے جس میں سینڈبرگ نے اوّل اوّل آباد ہونے والوں کے دور سے شروع کر کے خانہ جنگی کے زمانے سے ہوتے ہوئے امریکہ کی کہانی دہرائی ہے۔ چنانچہ ایک تبصرہ نگار نے اسے ایک ایسا رزمیہ کہا ہے جس میں انفرادی آزادی اور اپنا عرفان حاصل کرنے کی آرزو جھلکتی ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اصل خوبی ان کی بے باک استبازی ہے چنانچہ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ کتابیں دوسروں کی تفریح کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی باطنی تسکین کے لیے لکھی ہیں۔

ابراہم لنکن کی سوانح حیات کے لیے ۱۹۴۰ء میں سینڈبرگ نے PULITZER PRIZE حاصل کیا شاعری کے لیے اسے یہ انعام ۱۹۵۱ء میں حاصل ہوا۔ بے شمار موقعوں پر امریکہ کے تنہا "قومی شاعر" کی حیثیت سے اس کی عزت افزائی کی گئی جن میں وہ استقبال بھی شامل ہے جو صدر کینیڈی کی جانب سے WHITE HOUSE میں دیا گیا۔ اسے آزاد اور بے خوف جمہوری زندگی کا نشان قرار دیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایسا شاعر تھا جو ایک عام انسان کی مانند زندگی کے بارے میں نیز شہروں اور سبزہ زاروں کے حسن کے بارے میں سوچتا تھا۔ اسے زندگی سے گہری محبت تھی خواہ وہ ماضی کی ہو یا حال کی لیکن بالخصوص اس زندگی سے جو مستقبل سے وابستہ تھی۔

دور اوّل کی نظموں میں سے اس کی ایک نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

"میں ہی عوام ہوں اور میں ہی بھیڑ اور مجمع ہوں
کیا تمہیں معلوم ہے کہ دنیا کے تمام بڑے کام میرے ہی
ذریعہ ہوتے ہیں
میں ہی محنت کش مزدور ہوں میں ہی موجد اور دنیا والوں
کے رزق کا پیدا کرنے والا ہوں
میں ہی ان ناظرین میں ہوں جو تاریخ کا تماشہ دیکھتے ہیں
نیپولین بھی مجھ سے آتا ہے اور لنکن بھی مجھ سے پیدا ہوتا ہے
اور پھر وہ مر جاتے ہیں اور میں مزید نیپولین اور لنکن بھیجتا ہوں۔
میں بیج کی زمین ہوں۔"

سینڈبرگ کے بیٹے ۲۲ جولائی کو فلیٹ راک کے چرچ میں جہاں وہ بکریوں کے ایک فارم کے قریب رہتا تھا، ماتمی مجلسیں منعقد کی گئیں اس کی بیوہ نے جو مشہور فوٹوگرافر EDWARD STEICHEN کی بہن ہے کہا کہ اس کی لاش نذر آتش کی جائے گی اور اس کی راکھ REMEMBRANCE ROCK کی سرزمین پر جو اس کی جائے ولادت کے قریب واقع ہے اور جو سینڈبرگ کی پسندیدہ جگہ تھی، چھڑک دی جائے گی۔

(شکریہ ایڈیشن پی ای این ستمبر ۶۷ء)

(باقی صفحہ ۱۵ سے آگے)

کتاب پڑھنے پر اکسانے کا نام ہے، یہ اس وقت ہوگا جب تبصرہ اپنے جانبدار تاثر کی وجہ سے مصنف اور تبصرہ نگار دونوں کی چنگاری کو کچھ منتقل کر سکے۔

چند روز ہوئے پٹنہ سے مریخ نکلا ہے۔ یہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ادبی ترجمان ہے۔ سطور اولین میں کہا گیا ہے کہ حسن کا معیار صرف ایک ہے یعنی فکر و فن کا معیار۔ اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے ہم کسی گروہ کے طرف دار اور ترجمان نہیں، ہم صرف ادب خاص کر اردو ادب کے سخن فہم اور قدر شناس ہیں۔ یہ جذبہ قابل تعریف ہے اور اس لحاظ سے رشید احمد صدیقی پر شکیل الرحمن کے مضمون حتی نغمہ پر شعر اقبال کے مضمون اور اردو غزل پر عبد المغنی کے مضمون کی تعریف کی جاسکتی ہے مگر مظہر امام ہاشمی نے نئی شاعری پر اظہار خیال میں سخن فہمی سے زیادہ جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ شروع میں معارف اردو نامے ادب جیسے رسالوں کے متعلق یہ رائے کہ یہ ایک جمود کی نشاندہی کرتے ہیں محل نظر ہے۔ ایسے مخصوص پرچوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔

شمع اور بیسویں صدی جیسے رسالوں پر بھا فروختہ ہونے کی ضرورت نہیں انکو فلمی ادبی رسالوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس طبقے کے لیے تفریحی غذا فراہم کرتے ہیں جو ہلکے پھلکے ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ایسے رسالے ہر زبان میں مل جائیں گے اور مقبول بھی ہوں گے ادبی پرچوں کا مقصد دراصل ادبی غذا فراہم کرنا ہے۔ لوگوں کو قیمتی تجربات سے آشنا کرنا ہے۔ حسن کاری کے اچھے نمونے پیش کرنا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ذوق سلیم کی کمی ہے اس لیے اچھے رسالوں کی بھی کمی ہے۔ اس لیے پڑھنے والوں پر تبرا کرنے سے کام نہ چلے گا۔ ان کے ذوق کی تربیت کرنی ہوگی۔

آخر میں ایک قلمی رسالے کا خیر مقدم کرنا ہے۔ اس کا نام منزل ہے اور یہ نیویارک سے کچھ اردو دوستوں نے نکالا ہے۔ اس میں امریکہ میں مقیم اشخاص کی تحریریں انھیں کی تحریریں اور برصغیر کے رسالوں سے انتخابات عکسی طباعت میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ حسن مرحوم کے یاد وطن کے بعد امریکہ سے یہ پہلا اردو کا رسالہ نکلا ہے۔ امید ہے کہ یہ ترقی کرے گا اور اس کے ذریعہ سے نئی دنیا کے اردو دوستوں کے افکار و تاثرات برابر ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور

میرا صفحہ

خوشی کی بات ہے کہ ادھر ہندوستان میں اردو کے کئی ایسے رسالے نکلے ہیں جن میں معصر ادب کے تمام اہم میلانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ چند سال پہلے تک صبا حیدرآباد اور شاعر بمبئی ایک حد تک ہم عصر ادب کی نمائندگی کرتے تھے۔ پھر کتاب لکھنؤ نے اس طرف توجہ کی اور بہت جلد جدید شاعری جدید افسانہ اور معصر ہندوستانی ادب کے تراجم کی وجہ سے اپنے لیے ایک جگہ پیدا کرلی۔ اس میں جدید شاعری اور جدید افسانہ پر قابلِ قدر مضامین بھی شایع ہوئے۔ جون ۱۹۶۶ء سے شب خون الٰہ آباد سے نکل رہا ہے۔ اس پرچے کی کئی خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے ایڈیٹر نے اپنے تنقیدی مضامین اور تبصروں کے ذریعہ سے حق گوئی و بے باکی کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس نے خاص نمبروں کے ذریعہ سے شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ہر نمبر میں ایک قابلِ قدر معیار رکھا ہے۔ اس میں نہ صرف جدید شاعری اور جدید افسانہ کے اچھے نمونے ملتے ہیں، بلکہ جدید مغربی شاعروں کے تراجم بھی اکثر نظر آتے ہیں۔ جگبیتی بہ خلقِ خدا کے نام سے اس میں پڑھنے والوں کا ردِ عمل بھی مل جاتا ہے، مگر یہ ضرورت سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے اور انتخاب کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اردو کے بیشتر رسالے وقت پر شایع نہیں ہوتے اور ان کی طباعت و کتابت بھی جاذبِ نظر نہیں ہوتی۔ شب خون اس لحاظ سے جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ ہمارے ادبی حلقوں میں چونکہ سیاسی یا اخلاقی نقطۂ نظر زیادہ حاوی رہا ہے اس لیے اس کا جدید ادبی اور جمالیاتی رنگ کچھ لوگوں کو ناپسند ہے، مگر میں اسے ایک اچھا میلان سمجھتا ہوں۔ ادبی معیار میں سیاست یا اخلاق کی بھی جگہ ہوتی ہے مگر سیاست، ادب اور اخلاق کا اپنا اپنا طریقۂ کار ہے۔

جنوری ۱۹۶۷ء سے بھوپال سے مزاج نکلا۔ یہ نئی نسل کا پرچہ تھا اور قدرتی طور پر اس میں نئے پن کا جوش تھا اور پرانے شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں پر تبصروں میں تلخی تھی اور ایک طرح کی رعونت بھی۔ کچھ لوگ اس سے چڑتے ہیں لیکن میں اسے بھی ایک فطری میلان سمجھتا ہوں۔ شب خون کی طرح مزاج میں بھی کئی لکھنے والے سامنے آئے، اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے پاس کچھ کہنے کو تھا۔ نئی شاعری کی خصوصیات واضح کرنے کی اس پرچے نے قابلِ قدر کوشش کی۔ افسوس ہے کہ چھ یا سات پرچے نکلنے پائے تھے کہ یہ پرچہ مرحوم ہوگیا۔

بمبئی سے جب گفتگو نکلا اور اس کے اغراض و مقاصد پر نظر پڑی تو مجھے ایک پرانا لطیفہ یاد آیا۔

ایک بس میں فرسٹ کلاس، سکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے مسافر سوار تھے۔ بس ایک جگہ پہنچ کر خراب ہوگئی اور اسے ڈھکیلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ڈرائیور نے اعلان کیا، فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھے رہیں، سکنڈ کلاس کے مسافر اتر جائیں، اور تھرڈ کلاس کے مسافر اتر کر بس کو ڈھکیلیں۔ کچھ ایسی ہی تقسیم گفتگو نے کی تھی۔ پہلا درجہ ترقی پسند ادیبوں کا تھا۔ دوسرا بزرگ ادیبوں کا اور تیسرا نئے لکھنے والوں کا۔ حالانکہ اس درجہ بندی کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ پرانا اہم اور قابلِ قدر اور معنی خیز مکتبِ فکر کی نمائندگی کی کوشش کافی ہے۔ اس میں لکیریں اور خانے بنانے کی فکر کریں۔

گفتگو کے اب تک دو شمارے نکلے ہیں۔ اس میں کئی اچھے تنقیدی مضامین شایع ہوئے ہیں۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے بھی قابلِ قدر نمونے سامنے آئے ہیں، مگر اس میں شخصیتوں کے خاکوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حالانکہ ہم عصر فن پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ہم عصر فن کاروں کی شخصیت کا مطالعہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ گفتگو میں کئی ایسے مضمون بھی نکلے جو دوسرے رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ اگر کسی دوسرے رسالے کا کوئی اہم مضمون شایع کرنا ضروری معلوم ہو تو حوالہ دینا چاہیے۔ مضمون نگاروں کو بھی اپنا مضمون ایک سے زیادہ رسالے میں نہیں بھیجنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات بیچارے ایڈیٹر کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ مضمون کسی دوسرے رسالے کو بھی بھیجا گیا ہے۔

گفتگو ان خامیوں کے باوجود ایک اہم رسالہ ہے اور اس کے مستقبل سے شاندار توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

شب خون کے وزن پر الٰہ آباد سے شب رنگ بھی نکلا ہے۔ ابھی اس کے دو شمارے ہی دیکھنے میں آئے۔ اس کے ایڈیٹر ایک جانے پہچانے مصنف اور شاعر ہیں۔ اس پرچے کو ابھی اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، مگر دونوں میں فرق ہے۔ جدیدیت کو نئی رومانیت کہیے یا ترقی پسندی کا ردِ عمل، بہر حال یہ ترقی پسندی سے مختلف ضرور ہے۔ جدیدیت کے کچھ علمبرداروں کے یہاں نقالی یا سستی شہرت کا جذبہ یا سنسنی خیزی ہے تو اس کی وجہ سے جدیدیت کے تمام پہلوؤں کی اہمیت اور ان کی معنویت سے انکار مناسب نہیں۔ اسلام کے اصولوں اور کچھ مسلمانوں کے طرزِ عمل میں فرق تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادب میں ایک تاریخی رول انجام دیا ہے اور اس کے کارناموں سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر زندگی کی طرح ادب بھی بدلتا رہتا ہے اور اس میں نئے میلانات برابر آتے رہتے ہیں۔ ادب میں تسلسل کے ساتھ تغیر کی بھی اہمیت ہے، ہاں دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھنا آسان کام نہیں۔

دہلی سے ایک دو ماہی پرچہ ادبی تبصرے کے نام سے نکلا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ تبصروں کے فن پر توجہ دی جا رہی ہے۔ پہلے شمارے میں کئی قابلِ قدر تبصرے ہیں۔ پیرا ہنِ شرر، عکس لطیف، تراشیدہ اور نقشِ ہند پر تبصرے خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہیں گو مجھے بعض تبصروں میں خامیوں پر ضرورت سے زیادہ نظر آیا، خوبیوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ سمپوزیم میں تبصرے کے فن پر گفتگو گہرائی نہ پا سکی۔ ایسے موضوعات پر پہلے سے سوچ کر بات چیت کرنی چاہیے۔ اچھے تبصرے میں تبصرہ نگار کی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ تنقید سے زیادہ تبصرے میں اس کی گنجائش ہے کیونکہ تبصرہ محض عیب و ہنر گنانے کا نام نہیں ہے، پڑھنے والے کو

(باقی صفحہ ۱۰ کالم ۲ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا۔